رانا محبوب اختر*

حبیب جالب: لاہور کا عوامی چہرہ

Habib Jalib: The Public Face of Lahore

Abstract:

This paper delves into the multifaceted role of Habib Jalib as a revolutionary poet and his profound connection with Lahore. It explores how his experiences and empathetic understanding of the marginalized shaped his dedication to social justice. The paper further discusses how he used poetry as a powerful tool to criticize the prevailing socio-political order, encouraging action through both his verses and active political engagement. The study integrates biographical insights to illuminate Jalib's journey from his humble origins to becoming a political activist, enduring imprisonment for his dissent. Drawing on diverse influences including folk traditions and progressive literature, Jalib's poetry wielded irony and satire to articulate his ideological stance, defying censorship and resonating profoundly with audiences across the subcontinent. Despite adversity, Jalib's poetic voice emerged as a source of hope and empowerment for the masses, transcending geographical boundaries to inspire transformative societal change.

Keywords: Habib Jalib, Lahore, poetry, Urdu, injustice, censorship.

حبیب جالب(۱۹۲۸ء-۱۹۹۳ء)، بھارتی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کی بستی، میانی افغاناں میں ایک مہمند پٹھان کے گھر پیدا ہوئے۔ میانی افغاناں، بھارت کے ضلع ہوشیار پور میں دریائے بیاس اور ستلج کے دوآبہ میں واقع ہے۔ ایک ہجرت گزیدہ کے ناسٹلجیا کے ساتھ جالب نے اپنے آبائی گاؤں کو دوآبہ بہشت کا ''گلابہ'' کہا ہے۔ شام چوراسی جیسا موسیقی کا گھرانہ بھی اسی دوآبے سے تعلق رکھتا ہے۔ حبیب جالب نے نظم ''داستان دل دونیم'' میانی افغاناں کی یاد میں لکھی ہے[1]۔

حبیب جالب کے والد صوفی عنایت اللہ پیشے کے لحاظ سے جفت ساز تھے۔ حبیب جالب کا جنم دن ۲۴ مارچ ہے اور سال ۱۹۲۸ء کا ہے۔ پٹھان پرولتاری کے گھر عوامی شاعر کی پیدائش ایک واقعہ ہے۔ جالب لڑکپن میں میانی افغاناں میں اپنی نانی کے ساتھ مل کر آزار بند بیچتے رہے:

ہم آوارہ گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنالے[۲]

نانی انھیں کہانیاں سناتیں تو اگلے دن پکنے والے پکوانوں کے نام بھی گنواتی تھیں۔ اگلے دن روٹی مگر ”چڑی میوے“ کے ساتھ کھاتے تھے[۳]۔ قیاس ہے کہ ان کے آبا کا پیشہ غالب کی طرح سو پشت سے سپہ گری تھا۔ ان کی بیٹی طاہرہ جالب اور بیٹے یاسر جالب کا خیال ہے کہ جالب کے آبا غزنی سے محنت مزدوری کے لیے ہندوستان آئے تھے[۴]۔ پہلی ہجرت کی وجہ کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ ان کے آبا اس جدلیاتی معاشی، سماجی اور قبائلی جبر کا شکار ہوئے ہوں گے جو سپاہی پیشہ بننے کا لازمی نتیجہ ہے۔ معاوضے کے عوض زندگی کو بیچنے والے سپاہی۔ حملہ آور، سپاہیوں کے ذہن نظریے سے بھرتے ہیں اور انھیں قوم قبیلے اور وطن کے لیے قربانی کا درس ازبر کراتے ہیں۔ اپنے سپاہیوں کے لیے گم نام قبریں اور دشمن کے سپاہیوں کی کھوپڑیوں کے مینار بناتے ہیں۔ قبیلہ، وطن اور دھرم لشکر کے طاقت ور سوفٹ وئیر کا حصہ ہیں۔ مہمند قبیلے اور ہجرت و جفت سازی کے پیشے کی جدلیات جو بھی ہوں جالب نے تمام عمر طاقتوروں کو اپنی شاعری کے نشانے پہ رکھا! بورژوا سمراٹ یا جرنیل اور کمی اور سپاہی کی طبقاتی کش مکش، حبیب جالب کی کش مکشِ انقلاب ہے۔ اس کے ڈی این اے کی سپہ گری شاعری میں منقلب ہو گئی ہے۔ ان کے والد جوتیوں کے جوڑے بناتے تھے اور جالب نے تمام عمر انقلاب اور شعر کا جوڑا بنایا۔ ایک خواب بنا جس کا تانا مساوات اور بانا آزادی ہے۔ وہ کٹے پھٹے سماج کو شاعری سے صحت یاب بنانے کی آرزو کرتے ہیں۔ زخم سیتے ہیں۔ انقلاب کے چرخے پہ خوابوں کی مترنم روں روں ان کے شعروں اور نظموں میں اتر کر دلوں کو گرماتی ہے۔

حبیب جالب کی پیدائش کے وقت پاکستان کی پیدائش میں ۱۹ سال باقی تھے۔ حبیب جالب نے اپنے گاؤں کے سکول سے ساتویں جماعت پاس کی اور پھر دلی چلے گئے۔ دلی، صدیوں سے بستا اور اجڑتا رہا ہے۔ میر و غالب، دلی کی گنگا جمنی تہذیب کے دورِ زوال کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے مغل سلطنت کے عہد میں شاعری کی سلطنت بنائی۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ جالب کی طبیعت دلی میں شعر و سخن کی طرف راغب ہوئی۔ ساتویں کے امتحان میں ”وقتِ سحر“ کو جملے میں استعمال کرنا تھا۔ جالب نے جملے کی بجائے اپنا پہلا شعر امتحانی پرچے میں لکھا:

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور وہ
وعدہ شکن کو دیکھتے وقتِ سحر ہوا[۵]

تقسیم کے بعد کا زمانہ جالب کے لیے شکستِ خواب کا زمانہ ہے۔ ان کے خاندان کے لوگ کراچی، ملتان، فیصل آباد اور لاہور جیسے شہروں میں آباد ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ صوفی عنایت اللہ پلاٹ اور پرمٹ کے آدمی نہ تھے۔ ہجرت سے پیدا ہونے والے معاشی مواقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جالب نے فیصل آباد کی کوہِ نور ملز میں مزدوری کی۔ ان کے والد صوفی عنایت اللہ ملتان جا بسے۔ وہ حافظ جمال اللہ قبرستان ملتان میں دفن ہوئے۔ جالب کے شاعرانہ اطوار کے پیشِ نظر والد نے اپنے بیٹے

کو ملتان میں ایک گھر بنا کر دیا۔ حبیب جالب کا ملتان میں قیام مختصر رہا اور زیادہ وقت لاہور میں ساندہ، سنت نگر اور سروبا ٹاؤن میں گزرا۔ ان کی زوجہ ممتاز بیگم کے بطن سے جالب کے نو بچے ہیں۔ پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں (ناصر عباس، طاہر عباس، جمیلہ نورافشاں، انور عباس، لیلی جالب، طاہرہ جالب، یاسر جالب، رخشندہ جالب اور حجاب جالب)۔ جالب کی بیگم شیعہ مکتبِ فکر سے تعلق رکھتی تھیں جب کہ جالب خود شیعہ تو نہ تھے مگر مزاحمت ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ شعر فہم یاسر عباس (پ:۱۹۹۶ء) نے جالب کے کلام کا ایک ٹکڑا سنایا:

آب کے تیر چلے صحرا میں
پھول سے جسم جلے صحرا میں
قتلِ خورشید کے منظر کے سوا
کچھ نہ تھا شام ڈھلے صحرا میں[۶]

سروبا ٹاؤن، فیروز پور روڈ والا گھر حبیب جالب نے اپنے بابا کا دیا ہوا ملتان والا مکان بیچ کر خریدا تھا۔ کوئی سات سال وہ اس گھر میں رہے۔ غربت بیماری کی ماں ہے۔ دمہ اور پھیپھڑوں کی بیماری سے مجبور ہو کر جالب لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں داخل ہوئے تو سروبا ٹاؤن والا گھر کرائے پر دے کر ان کا کنبہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک میں منتقل ہو گیا تا کہ شاعر بابا کی تیمارداری میں آسانی رہے۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۳ء کو حبیب جالب، شیخ زید ہسپتال کے النہیان وارڈ کے کمرہ نمبر ۱۴ میں انتقال فرما گئے اور سبزہ زار کے شاہ فرید قبرستان میں لاہوری مٹی کی چادر اوڑھے سوتے ہیں۔ ۱۳ جنوری ۲۰۲۳ء کو جالب کی وفات کے کوئی تیس سال بعد ہم جالب کے دو بچوں کے ساتھ شاعر کی ایک ایسی تصویر کے نیچے بیٹھے ہیں جو شہر لاہور میں کھینچی گئی تھی اور جس میں ان پر لاٹھیاں برسائی جا رہی ہیں اور اسی شہر لاہور کے علاقے اقبال ٹاؤن کے ایک گھر میں ہمارے سامنے بیٹھی بیٹی طاہرہ جالب کی آنکھوں سے آنسو برس رہے ہیں۔ تصویر میں حبیب جالب کے جسم پر جب کہ طاہرہ جالب کے آنسوؤں سے ہمارے دل پر لاٹھی چارج جاری ہے۔ کیسا ستم ہے کہ دنیا کو مسخر کرنے والے آدمی کے پاس اپنے ہی وجود اور جسم پر لگنے والے دکھوں کا کوئی علاج نہیں!

۱۹۴۷ء میں انڈیا کا بھارت اور پاکستان کے نام سے بپتسمہ ہوا۔ آزادی ملی۔ یہ آزادی موہوم تھی کہ اقتدار سامراج کی پروردہ اشرافیہ سے عوام کو منتقل نہیں ہوا تھا! آبادی کے تبادلے کے دوران صدیوں میں بوئی گئی سامراجی نفرت کی فصل کٹنے کو تیار تھی۔ لاکھوں لوگ ہندو، مسلمان اور سکھ بنا کر مارے گئے تھے۔ آدمیت پر قابیل کا سایہ گہرا ہو گیا تھا۔ بدیسی حملہ آوری اور قتال کی طویل صدیوں کے بعد یہ مقامی لوگوں کا مقامیوں کے ہاتھوں قتلِ عام تھا جس میں دونوں طرف سے غریب زمیں زاد مارے گئے اور سامراجی انتظامیہ دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ خاموش پیغام تقسیم کے قتال میں یہ تھا کہ ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہو گا۔ کہ تم وحشی ہو، ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور ہمارا تہذیب آموزی کا بیانیہ درست تھا۔ فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) نے آزادی کی صبح کو

شب گزیدہ سحر کہا[۷]۔ علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء-۲۰۰۰ء) نے ''صبحِ فردا'' جیسی نظم لکھی[۸]۔ حبیب جالب نے اپنی نظم ''۱۴ اگست'' میں آزادی کے خواب کی شکست کا نوحہ لکھا ہے:

کہاں ٹوٹی ہیں زنجیریں ہماری
کہاں بدلی ہیں تقریریں ہماری
وطن تھا ذہن میں زنداں نہیں تھا
چمن خوابوں کا یوں ویراں نہیں تھا
بہاروں نے دیئے وہ داغ ہم کو
نظر آتا ہے مقتل باغ ہم کو[۹]

حبیب جالب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند سیاسی کارکن تھے۔ شیخ زید ہسپتال کے بسترِ مرگ سے مظفر محمد علی (۱۹۲۹ء-۲۰۰۰ء) کے ساتھ اپنے آخری انٹرویو میں جالب نے کہا کہ تمام عمر عبد الغفار خان (۱۸۹۰ء-۱۹۸۸ء) اور ولی خان (۱۹۱۷ء-۲۰۰۶ء) کی نیشنل عوامی پارٹی سے وابستہ رہے۔ آج اس کی وارث اے این پی ہے۔ جب اے این پی نے ایک جرنیل کی سرپرستی میں بننے والی آئی جے آئی سے موقع پرستانہ تعاون کیا تو حبیب جالب جماعت سے دور ہو گئے۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا:

> عوام نے مجھے عوامی شاعر کے جس لقب سے سرفراز کر رکھا ہے میں اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔ میں کل بھی عوام کے ساتھ تھا آج بھی ان کے ساتھ ہوں اور مستقبل میں بھی میری روح عوام کے ساتھ رہے گی۔ میری ساری زندگی ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے گزری ہے اور بسترِ علالت پر شدید نقاہت کے عالم میں بھی خود کو اس لیے توانا محسوس کرتا ہوں کہ میرے عوام نے ظلم کے خلاف ہار تسلیم نہیں کی۔ یہ جنگ جاری ہے اور میں عوام کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ آخری فتح تک یہ جنگ جاری رکھیں گے[۱۰]۔

جلسوں میں دل کو گرمانے والی آواز اور شاعری سے آگے بڑھ کر حبیب جالب نے ۱۹۷۰ کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ مسترد کر کے نیشنل عوامی پارٹی کے ٹکٹ پر گڑھی شاہو کے حلقے سے انتخاب لڑا۔ روایتی طور پر یہ ریلوے مزدوروں اور پرولتاری طبقے کا حلقہ ہے۔ اس حلقے میں کچھ پٹھان ووٹرز بھی ہیں۔ ان کے مخالف حبیب جالب کے خلاف جلسوں میں حبیب جالب کی نظمیں پڑھتے تھے۔ حبیب جالب کو اس الیکشن میں کل ۷۵۰ ووٹ پڑے اور ان سات سو پچاس ووٹوں میں احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۶ء) کا ووٹ اور محمد طفیل نقوش (۱۹۲۳ء-۱۹۸۶ء) کے اعزا کے کچھ ووٹ بھی شامل تھے[۱۱]۔ کارپوریٹ جمہوریت میں حبیب جالبوں اور شاعروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی کہ ووٹ کی طاقت کو سرمائے کے مراکز کے حق میں استعمال کرنے کی سائنس شاعری اور آرٹ سے الگ ہے! قدیم یونان میں بھی سقراط کو یونان کی جمہوری پارلیمان نے موت کی سزا دی تھی!

اشرافیائی ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے برعکس جالب صحیح معنوں میں مارکسی پرولتاری اور عوامی شاعر ہیں۔ ترقی پسند

تحریک انڈین برصغیر کی ایک اہم ادبی اور کلچرل تحریک تھی جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں منظر عام پر آئی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیب اور دانشور ادب اور دوسرے فنون کو سماجی انصاف، مساوات اور آزادی کے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا آدرش رکھتے تھے۔ ان لکھاریوں کا مقصد ایسا ادب تخلیق کرنا تھا جو جمالیات کی کسوٹی پر پورا اترنے کے ساتھ ساتھ سماج میں تبدیلی کا نقیب ہو۔ ملک راج آنند(۱۹۰۵ء-۲۰۰۴ء)، سجاد ظہیر(۱۹۰۵ء-۱۹۷۳ء)، احمد علی(۱۹۱۰ء-۱۹۹۴ء) اور عصمت چغتائی(۱۹۱۵ء-۱۹۹۱ء) جیسے لکھنے والے اس تحریک کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔ یورپی قبضے کے بعد انڈیا میں حیرت انگیز ردِّعمل آیا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ۱۹۴۷ء کی تقسیم تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصے میں بڑی تعلیمی، اصلاحی، سیاسی اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں سے برہمو سماج، دیوبند، علی گڑھ، کانگریس، مسلم لیگ، ویر ساورکر(۱۸۸۳ء-۱۹۶۶ء) کی ہندو مہاسبھا، نیتاجی سبھاش چندر بوس(۱۸۹۷ء-۱۹۴۵ء) کی انڈین نیشنل آرمی، بھگت سنگھ(۱۹۰۷ء-۱۹۳۱ء) اور اشفاق اللہ خاں (۱۹۰۰ء-۱۹۲۷ء) کی ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن اور اس طرح کی بہت سی دوسری تحریکیں شامل تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں ممبئی کی رائل انڈین نیوی کی بغاوت برطانوی راج کے تابوت کا وہ آخری کیل ہے جس کے بعد دل کا جانا صبح یا شام کی بات تھی۔ آزادی کی جدوجہد میں ترقی پسند تحریک ادبی اور فنی دنیا کا اہم سنگ میل ہے۔ مقامی زبانوں کی ترویج اور ترقی کی روشن نظری بھی ترقی پسندانہ رویہ ہے۔ یہ لکھاری نظریاتی طور پر مارکسی تھے اور روایتی سماجی اور معاشی ڈھانچوں کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ تبدیلی کا خواب بھوک سے نجات اور مساوات، صنفی برابری اور آزادی کی پری کو زمین پر بسانے کا خواب ہے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہونے والی ترقی پسند تحریک کے بانیوں کی پہلی کانفرنس میں پریم چند (Premchand۔۱۸۸۰-۱۹۳۶ء) نے اپنے خطبے میں کہا: ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر اور آزادی کا جذبہ ہو۔ تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''[۱۲]۔

ترقی پسند عملی سیاست کے جرم میں شاید ہی کسی شاعر نے قید و بند اور ایسی تنگ دستی دیکھی ہو جو حبیب جالب کی قسمت ہوئی۔ حبیب جالب مجموعی طور پر لگ بھگ دس سال پس زنداں رہے اور مسلسل تیس سال ان کا پاسپورٹ حکومت کے قبضے میں رہا۔ مجروح سلطان پوری(۱۹۱۹ء-۲۰۰۰ء) ۱۹۴۹ء میں نہرو کو ہٹلر اور آہنسا کو ڈالر بھری زہر کہنے کے جرم میں گرفتار ہوئے مگر ان کی قید دو سال کی تھی۔ فیض احمد فیض ۱۹۵۱ء میں زنداں کو گئے اور ان کی قید کی وجہ شاعری نہیں، راولپنڈی سازش کیس تھا۔ فیض نے چار سال قید کاٹی۔ ایوب خان کا مارشل لا لگنے کے بعد دو سال کے اندر ستمبر ۱۹۶۰ء میں پاکستان کے تین دریا بیچنے کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ پنجاب اب پانچ نہیں، دو دریاؤں کی سرزمین ہے۔ ۱۹۶۲ء میں فوجی آمر نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی جگہ اپنا دستور دیا تھا جس پر جالب نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''دستور'' لکھی۔ یہ نظم آج بھی حسبِ حال ہے۔

عملی سیاست سے حبیب جالب کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی شاعر کے حصے میں آئی ہو مگر اس راستے میں انھوں نے قید و بند اور کسمپرسی کے کئی سال گزارے۔ ان کی اہلیہ ممتاز بیگم (وفات: ۲۰۱۴ء) ایک بچے کی انگلی پکڑے، ایک

بچہ اٹھائے اور ایک بچہ پیٹ میں لیے جیل ملاقات کی غرض سے جایا کرتیں۔ جالب نے ایوب خان کے خلاف فاطمہ جناح (۱۸۹۳ء-۱۹۶۷ء) کا ساتھ دیا تو گورنر امیر محمد خان (۱۹۱۰ء-۱۹۶۷ء) نے انھیں گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا لیکن جالب نے کہا: "جتنا مجھ پر ٹارچر ان شاعروں نے کیا اتنا پولیس نے بھی نہیں کیا ہے"[۱۳]۔ جالب کی مقبولیت سے ان کے ہم عصر شعرا کی اکثریت خوش نہیں تھی۔ ایک شاعر ساحل فارانی کی ڈیوٹی لگی تھی کہ اس نے حبیب جالب کو گرفتار کرانا ہے۔ مضحکہ خیز مقدمات میں سے ایک یہ تھا کہ حبیب جالب نے ہیرا منڈی میں مجرا سنتے ہوئے ایک شخص سے ایک ہزار روپیہ لیا جس کی واپسی کے لیے جالب دھر لیے گئے۔ ایک دفعہ ان کے تھیلے سے دو بوتلیں شراب کی برآمد کر لی گئیں۔ ایک ایسی ایف آئی آر بھی کاٹی گئی جس میں الزام تھا کہ حبیب جالب نے چاقو سے ایک شخص کو زخمی کر دیا ہے۔ عدالت میں اس شخص کی خون آلود قمیض پیش کی گئی۔ پاکستان میں حبیب جالب مابعد نوآبادیاتی عہدِ ستم کے ستم رسیدہ مگر بہادر شاعر ہیں۔ ان پر جو ظلم ہوا سقراط بھی ہوتا تو پناہ مانگتا! جالب نے مولانا بھاشانی (۱۸۸۰ء-۱۹۷۶ء) کا اک عجب واقعہ لکھا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ایوب اور فاطمہ جناح کے بیچ صدارتی انتخاب میں بھاشانی کے بی۔ڈی۔ امیدوار جیت گئے تھے مگر فاطمہ جناح ہار گئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جالب کو بتایا کہ ووٹ خریدنے کے لیے مولانا بھاشانی کو پیسے دیے گئے تھے۔ تاہم نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت جب بھاشانی سے پوچھتی تو وہ بات کو ٹال جاتے۔ آخر ایک دن زچ ہو کر انھوں نے اعتراف کیا کہ "ہم نے نہیں لیا، لڑکا لوگوں نے لے لیا ہوگا"[۱۴]۔

حبیب جالب کی ایک یادگار نظم اداکارہ نیلو بیگم (۱۹۴۰ء-۲۰۲۱ء) پر ہے۔ شہنشاہ ایران پاکستان آئے تو ایک تقریب میں نیلو کو رقص کے لیے کہا گیا۔ نیلو کا ان دنوں فلم ساز ریاض شاہد (۱۹۳۰ء-۱۹۷۲ء) سے معاشقہ چل رہا تھا اور اس نے سرکاری تقریب میں جانے سے انکار کر دیا۔ تھانے دار نے انکار پر اداکارہ کو تھپڑ مارا تو صدمے سے نیلو نے خواب آور دوائیں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ اس پر حبیب جالب نے نیلو کو سامراج مخالف کردار مانتے ہوئے "نیلو" نظم لکھی جو بعد میں فلم زرقا کا گانا بنی[۱۵]۔

قدیم زمانوں سے جاگیردار اور استعماری قوتیں مذہب کا استعمال سٹیٹس کو (status quo) برقرار رکھنے کے لیے کرتے رہے ہیں۔ سرائیکی شاعر رفعت عباس (پ: ۱۹۵۷ء) ملا کو حاکم کی بنائی ہوئی پرانی مشین کہتے ہیں جو گوٹھوں اور بازاروں میں حاکم کا ڈر پہنچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے:

ملا ہک مشین پرانی حاکم آپ بنائی
گلی گلی وچ لوکیں تانیں ڈر پچاون کیتے[۱۶]

(ترجمہ: ملا ایک پرانی مشین ہے جو حاکم نے خود بنائی ہے، اس کا مقصد گوٹھوں اور بازاروں میں لوگوں کے دلوں میں حاکم کا خوف پہنچانا ہے۔)

حبیب جالب نے ملا کے کردار پر "مولانا" کے نام سے نظم لکھی ہے:

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا

خدارا شکر کی تلقین اپنے پاس ہی رکھیں
یہ لگتی ہے مرے سینے پہ بن کر تیر مولانا
نہیں میں بول سکتا جھوٹ اس درجہ ڈھٹائی سے
یہی ہے جرم میرا اور یہی تقصیر مولانا
حقیقت کیا ہے یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سنا ہے جمی کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا
زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمہیں تحریر مولانا
کروڑوں کیوں نہیں مل کر فلسطیں کے لیے لڑتے
دعا ہی سے فقط کٹتی نہیں زنجیر مولانا[۱۷]

تقسیم کے وقت مذہب کفر، انسانیت بربریت اور محبت نفرت میں بدل گئے تھے۔ سامراج نے سرحد کی پل صراط کو تلوار سے تیز اور بال سے باریک بنایا اور لاکھوں بے گناہ لوگ نفرت کے جہنم میں جا گرے۔ جبیب جالب نے لکھا: "تقسیم کے وقت نفرت اور منافرت عروج پر پہنچ گئی تھی۔ دنیا ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ لوگ پاگل ہو گئے تھے۔ انسانیت مر چکی تھی اور احساس ختم ہو چکا تھا[۱۸]۔"

ایک بڑا قتلِ عام ہوا۔ دونوں طرف کی ہندو مسلم آبادی پر قہر ٹوٹا۔ حکمران اشرافیہ نے سرحد کے دونوں اطراف پاگل پن کو قربانی کہا۔ حالاں کہ قربانی اختیار اور قتل جبر ہے۔ ہجرت کے بعد جالب محنت مزدوری کے لیے کراچی، ملتان اور فیصل آباد بھٹکتے رہے اور بالآخر لاہور کو مدینہ بنایا۔ شکستِ خواب کے بعد میانی افغاناں کے مہمند موچی کے گھر پیدا ہونے والے جالب لاہور کے موچی دروازے جا نکلے اور پشاور کے قصہ خوانی بازار، کراچی، بمبئی اور دلی سے گوالیار تک افتادگانِ خاک کا منظوم قصہ کہنے لگے۔ گوالیار جا کر جالب خوش ہوئے کہ گوالیار گائیکوں اور بہادروں کا شہر ہے۔ اکبر (۱۵۴۲ء-۱۶۰۵ء) کے دربار میں اٹھارہ میں سے گیارہ گویے گوالیار کے تھے۔ موسیقی کے سمراٹ، تان سین (۱۵۰۰ء-۱۵۸۹ء) گوالیار میں اپنے مرشد، شاہ محمد غوث گوالیاری (وفات: ۱۵۶۲ء) کے قدموں میں دفن ہیں۔ ملہار اور دیپک پر مٹی کی چادر اوڑھی ہے۔ زمین کے پاتال میں پانی اور آگ ایک ہیں۔ کائنات کی عظیم سمفنی عجب ہے! روایت ہے کہ تان سین کے مزار پر ایک بیر کا پیڑ ہے جس کے پتے کھانے سے گلوکاروں کے گلے سریلے ہو جاتے ہیں۔ آزادی کی سمراٹ، رانی جھانسی کا مرقد بھی گوالیار میں ہے۔ جالب نے گوالیار کے ایک مشاعرے کی روداد جالب بیتی میں لکھی ہے۔ ایک رات کی روداد جب جالب کے لفظ و آواز کی کرامت سے زبان دانی کے خمار سے مست جغادری شاعروں کو مات ہوئی اور جالب بے پناہ داد و تحسین سے سرخرو ہوئے!

حبیب جالب کے دل میں انسانوں کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ محبت، مارکسی انقلابی فکر کی ماں ہے۔ مارکس (Karl Marx۔ ۱۸۱۸ء-۱۸۸۳ء) کی جینی سے محبت میں وہ مستور ہے جس کا رخ انفس سے آفاق کی طرف ہے۔ مارکس کی جینی سے محبت اور شاعری کے سرچشمے ہمدردی، رحم اور حکمتِ صوفیہ اور نسائی اصول سے پھوٹتے ہیں۔ محبت کی طرح انقلاب کا رنگ بھی سرخ ہے۔ بیسویں صدی مارکسی انقلابات کی صدی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے چھ سال بعد ہوشیار پور کے ایک مزدور کے گھر پیدا ہونے والے بے نوا بچے کو شاعری، انقلاب اور محبت نے گود لیا تھا۔ انقلاب کی لوریوں نے اسے کروڑوں افتادگانِ خاک کی آواز بنا دیا تھا۔

لاہور میں جالب کی آمد پر سرسوتی اور لکشمی میں یدھ ہوا۔ آرٹ اور دولت کی دو دیویوں کا یدھ۔ جالب کی زندگی اور شاعری اسی یدھ کی کتھا ہے۔ ہجرتوں کی جدلیات مادی اور معاشی ہوتی ہیں۔ حبیب جالب کے شہرِ وجود پر سرسوتی کے ساتھ انقلاب کے آدرش کا قبضہ ہو گیا۔ لاہور شہر پر لکشمی قابض تھی۔ جالب کے پاس حکمت و محبت کی حکایت نظم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ انقلابی، عوامی اور مترنم شاعری اس کی تقدیر تھی۔ جالب کی inner reach اس کی شاعری ہے۔ تمام عمر لکشمی کی کشش جالب کو نہ رجھا سکی اور شاید جالب کے پاس لکشمی تو کیا، اپنی اولاد کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ ایوب خان، امیر محمد خان اور ایک بار بے نظیر بھٹو (۱۹۵۳ء-۲۰۰۷ء) نے لکشمی کو جالب کے گھر کا پتہ بتایا مگر جالب نے ہر بار دولت کو دھتکار دیا۔ بے نظیر بھٹو نے جالب کو بیٹی جمیلہ نور افشاں کی شادی پر امداد دینے کی پیش کش کی تو جالب نے کہا کہ پنجاب کی روایت میں بیٹیوں سے لیتے نہیں انھیں دیتے ہیں۔ انقلاب اور آزادی کی طلسمی جھنکار کے سحر میں گرفتار شاعر نے غربت، جہالت، نفرت اور طاقت کی دیویوں اور دیوتاؤں کے خلاف ۶۴ سال گلوگیر جدوجہد کی اور بالآخر ۱۳ مارچ، ۱۹۹۳ء کو جالب سرسوتی اور لکشمی کی جدلیات سے ماورا اپنے خالق سے جا ملے۔ آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں، جب جالب جیسے آشفتہ سروں کے دکھ یاد آتے ہیں۔

لاہور جغرافیے اور نظریے کی قید کے باوجود عالم میں انتخاب شہر ہے۔ رام کے بیٹے لوہو سے نسبت اور گوتم بدھ کا لاہوری گیٹ کے محلہ مولیاں میں قیام کا ذکر تو فنتاسی اور ناقابل اعتبار بیان (apocrypha) کے زمرے میں آتا ہے کہ یہ اساطیری عہد کی باتیں ہیں۔ بھٹی راجپوتوں اور جے پال کے قصے تاریخی ہیں۔ فصیل کے اندر عہدِ وسطیٰ کا ماضی آج شہر کی صورت سانس لیتا ہے۔ شیخ عبدالمجید جیسے لاہور کے عاشقوں کے حسنِ ظن اور حسنِ بیان کی تشکیل کا لاہور، رومانس ہے۔ انھوں نے پانینی کا مقام پیدائش اٹک کے Shalatula یا Salatula کی بجائے لاہور لکھا ہے جب کہ گوپی چند نارنگ (۱۹۳۱ء-۲۰۲۲ء) نے پانینی کو ملتان کی شہریت دے رکھی ہے۔ داتا گنج بخش لاہور شہر کے پیٹرن سینٹ ہیں۔ انھوں نے لاہور کو یکے از مضافات ملتان لکھا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء تک چودہ سال لاہور مغل پایہ تخت رہا اور شہر کی فصیل لاہور کی تاریخ ہوئی۔ فصیل کے تیرہ دروازے ہیں۔ دلی گیٹ، روشنی گیٹ، اکبری گیٹ، یکی گیٹ، بھاٹی یا بھٹی گیٹ، شیر انوالہ گیٹ، لوہاری گیٹ، کشمیری گیٹ، موری گیٹ، مستی گیٹ، شاہ عالم گیٹ، ٹکسالی گیٹ اور موچی گیٹ، انھی دروازوں سے شہر آدمی پر کھلتا ہے۔ فصیل کے اندر کا شہر دو اعشاریہ سات کلومیٹر پر محیط ہے اور اندرون کی آبادی کوئی پانچ لاکھ ہے۔ شاہی حمام، کوچۂ غبار چاں، گلی سور جن سنگھ اور پیشوں کے

اعتبار سے گلیاں، کنواں دینا ناتھ، ایک گھر کی پیشانی پہ David's star کی تحریر، مسجد وزیر خاں، شاہی مسجد کے سائے میں شاہی محلہ، پھجے کے پائے، خلیفہ کی خطائیاں اور جیدے کی لسی شہر کی حیران کن تکثیریت اور پکوانوں کے درشن ہیں۔ فصیل کے باہر کا شہر پوسٹ کولونیل ہے۔ شہر، عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ماہ ہے۔ پہلوی میں ماہ شہر ہے۔ ماہ، چاند ہے کہ مہینے نئے چاند کے درشن سے بدلتے ہیں۔ ہندی میں ماہ، ماگھ ہے۔ اکادیوں کے ہاں دیوتائی سحر کا پرتو، شہر ہے۔ سحر سے شہر ہے اور شہر بانو، صبح کی شہزادی ہے۔ شہر زاد، کہانیوں کی دیوی ہے۔ سنسکرت میں صبح کی دیوی اوشا ہے جس کے نام پر قدیم شہر اُچ آباد ہے۔ صوفیوں کے ہاں شہر، وجودِ مطلق ہے۔ منازلِ سلوک میں عشق کے سات شہر ہیں۔ مولانا روم (۱۲۰۷ء-۱۲۷۳ء) سے منسوب ایک شعر فریدالدین عطار (۱۱۴۵ء-۱۲۲۱ء) پہ ہے:

هفت شهر عشق را عطار گشت
ما هنوز اندر خمِ یک کوچه ایم

(ترجمہ: عطار نے عشق کے سات شہروں کی سیر کی۔ جبکہ ہم ابھی تک اس کی ایک گلی کے موڑ پر ہی کھڑے ہیں۔)

ابنِ عربی (۱۱۶۵ء-۱۲۴۰ء) آدمی کو انسان صغیر اور حقیقت مطلقہ کو انسان کبیر کہتے ہیں۔ فارسی میں شہر کا مطلب ظاہر ہونا ہے۔ زندگی کی طرح شہروں کی گلیاں بھی بھول بھلیاں ہوتی ہیں۔ شہروں کی اپنی مابعد الطبیعات اور اسرار ہوتے ہیں۔ لاہوری یا لہوری دروازہ بابِ گل رخاں ہے۔ دروازے کے پیچھے ایک دوسرے سے جڑے بہت سے مکان ہیں۔ مکین مسجودِ ملائک ہیں۔ کاسب جو خدا کے حبیب اور مارکس کے پرولتاری ہیں۔ علامہ اقبال مارکس کو ایسا کلیم اور مسیح کہتے ہیں جس کی بغل میں کتاب ہے[۱۹]۔ ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں تیسرا مشیر کہتا ہے:

وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب[۲۰]

سامی روایت کا ہابیل پہلا پرولتاری ہے۔ چرواہا جسے جاگیر دار قابیل قتل کرتا ہے۔ آدم کے کنبے میں ملکیت فساد کی جڑ ہے۔ قابیل کو ہابیل کی قربانی کی قبولیت کا رنج تھا۔ آدمی مرد اور عورت، کسان اور چرواہے، قاتل اور مقتول، فاتح اور مفتوح، آقا اور غلام، سرمایہ دار اور مزدور، بورژوا اور پرولتاری کے اضدادی جوڑوں کی جدلیات کا اسیر ہے۔ مظلوموں اور پرولتاریوں کی قسمت بدلنے کو بادشاہ، مسیحا، فلسفی، صوفی اور شاعر آئے ہیں۔ غریبوں اور غربت نے مگر سب کو مات دی ہے۔ کوئی بھی غربت کا کافی اور شافی علاج نہ کر سکا۔ خاندان اور قبیلے کی جدلیات میں ملکیت اور طاقت کے گھمنڈ کو نسلی مجانست، وضعی مطابقت اور نسبتوں کی

مناسبت سے گوارا بنایا گیا ہے۔ معاشی نظام، خاندانی، قبائلی اور ریاستی نسبتوں کے اسیر ہیں، منصفانہ نہیں ہیں۔ باپ، سردار، راجہ، بھون، وراٹ، سوراٹ اور سمراٹ طاقت کے استعارے ہیں۔ دیوتا اور دیویاں طاقتوروں کے اتحادی ہیں۔ قرونِ وسطی کے سمراٹوں اور بادشاہوں کی سلطنتیں موروثی، استبدادی اور سامراجی تھیں۔ جغرافیے، تاریخ، رنگ، نسل، مذہب اور تہذیب سے ماوراہر بادشاہت ظالمانہ ہوتی ہے۔ آدمی کے دکھ بادشاہوں اور مسیحاؤں سے بڑے ہیں۔ دوا سے ماوراہیں۔ مسیحائی سراب ہے۔ گوتم نے زندگی کو کارِ عبث جان کر بہت پہلے کہا:

حیات دکھ ہے
ممات دکھ ہے
یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے[۲۱]

گوتم نے کہا کہ دکھ سے نجات جیون چکر سے نکل جانے میں ہے۔ گوتم کامرن برت مگر سونے کے پیالے میں پیش کی گئی سجاتا کی کھیر پہ ختم ہوا تھا۔ سجاتا جو زندگی کے مارے ہوئے گوتم سے بیٹے کا وردان مانگنے آئی تھی۔ ممتائیت کو معلوم ہے کہ زندگی، دکھ سے بڑی ہے۔ گوتم نروان کا اسیر اور سجاتا زندگی کی گوپی ہے۔ زندگی کے جمال میں موت کے جلال کی جھلکیاں، عارفوں کی نظر میں کسی احمرِ عروسی کے وصل کا بلاوا ہیں اور زندگی موت سے بڑی ہے۔ جاری رہتی ہے۔ صوفی اور سادھو کی تجریدی جدلیات زمین سے ماوراہے۔ مارکسی انقلاب زمینی ہے۔ زمینی دکھوں سے نجات کی مادی کش مکش، آزادی، خوشی اور خوش حالی سے قلوب کو بدلنے کا عمل ہے۔ جدید اور بشر مرکز آدمی نے پیامبروں کے انقلاب کو بادشاہ اور پادری کے ساتھ مل کر بیچا اور آئیڈیالوجی قابیلی نظریہ بن گئی۔ قابیل جو قبضہ گیر آدمی کا مثلِ اولیٰ ہے۔ مارکس نے کہا کہ فلاسفرز کا کام صرف دنیا کی تفسیر کرنا نہیں، دنیا کو بدلنا ہے۔ ترقی پسند دنیا کو بدلنے کے خواب کو لاہور لائے تو علامہ اقبال سمیت سب نے ان کا ساتھ دینے یا اخلاقی سپورٹ دینے کا وعدہ کیا۔ سجاد ظہیر روشنائی میں رقم طراز ہیں:

> ہم میں سے کسی کو بھی یہ وہم و گمان نہیں تھا کہ لاہور کی ادب پرور سرزمین پر یہ وہ پہلا لغزیدہ قدم ہے جو بعد میں اردو ادب میں سنہرے خوشوں کا انبار لگا دے گا۔ چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر، فیض، بیدی، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر، فکر، عارف، رہبر، اشک وغیرہ جیسے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے حصے کے ادیبوں کے لیے قابلِ رشک بن گئیں[۲۲]۔

حبیب جالب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ صرف لاہور بلکہ پورے پاکستان اور برصغیر میں سب سے زیادہ سنے جانے والے شاعر تھے۔ عملی طور پر ترقی پسند سیاست دان تھے۔ وہ جلسوں کے شاعر تھے۔

شہر لاہور کی ایک خوش گوار صبح کچھ نیم یوگی لوہاری دروازے حاجی نہاری کا ناشتہ کرنے گئے۔ ذوق اور ذائقہ، یوگی اور صوفی کا علاقہ ہے کہ وہ جرعے کو چکھ کر میخانے کا سوچتے ہیں۔ عارف کے لیے عرفان چکھنے کے مترادف ہے۔ یوگی، سادھو اور صوفی

برہمچاری تو ہو سکتے ہیں، شاکاہاری نہیں۔ اس صبح، گئی رات کی بارش سے لاہور کی گلیاں دھلی ہوئی تھیں۔ عمارتوں پر سورج کا گلال برستا تھا۔ یوگیوں نے حاجی نہاری کی طرف چلنا شروع کیا کہ پان چباتا ہوا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ان کے سامنے آن کھڑا ہوا اور بولا: ”لگتا ہے باؤجی آپ دور سے آئے ہیں، اس لیے دیر سے آئے ہیں۔ حاجی کی نہاری ختم ہو گئی ہو گی۔“ اسے الہام ہوا تھا کہ یوگی حاجی کی نہاری کھانے آئے ہیں۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ اگر وہاں سے کچھ نہ ملے تو دائیں طرف تھوڑی دور جا کر ایک دکان اور ہے، اس کے پاس بھی اچھا ناشتہ ملتا ہے۔ دھوتی پوش پان چباتے آدمی کی بات درست ثابت ہوئی۔ ذائقے اور ذوق کے شوق کے قتیل حاجی نہاری پر پہنچے تو ملازمین برتن سمیٹ رہے تھے۔ وہ ترا ہے پر واپس آ کر دائیں گلی میں ایک دوسری دکان پر پہنچے ہی تھے کہ وہی لاہوریا دوبارہ نمودار ہوا اور دکان دار سے مخاطب ہو کر بولا: ”یہ لوگ دور سے آئے ہیں ان سے پیار کرنا ہے!“ گلابی جاڑوں کے علاوہ لاہور کا حسن ذائقے اور زبان سے ہے۔ ذوق کی دنیا جو کشف المحجوب کے خالق، علی ہجویری اور اکبرِ اعظم جیسے ناموروں کو لاہوری بناتی ہے۔ ذوق، ذائقہ ہے۔ لوہو کے نام پر بسے شہر میں راجپوت زمیں زاد، خوش خوراک کشمیری، سکھڑ ارائیں، قزلباش اور ککے زئی پٹھان اور زمین و زمانے سے جڑے ہوئے جاٹ بستے ہیں۔ بھانت بھانت کے یہی لوگ زندہ دلانِ لاہور ہیں۔ یہ لوگ لاہور کا عوامی چہرہ ہیں۔ کولونیل افسر، سیاست کار اور لوبھی تاجر لاہور کا استحصالی چہرہ ہیں جو ملا سے مل کر لوٹ مار کرتے ہیں جب کہ پرولتاری زمیں زاد گمراہوں کے لیے خضر ہیں۔ راستہ بتاتے ہیں۔ پیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ بقول غالب:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

پان کھاتے ہوئے، بابِ گل رخاں کے بے نام آدمی کی آواز میں لاہور کے پرولتاری شاعر، حبیب جالب کی آواز کی سی نغمگی تھی۔ لفظ جالب کا مطلب اپنی طرف راغب کرنا ہے۔ محبت، غنائیت، انسانیت اور دردمندی کا وہ ملاپ جو آدمی کو آدمی کی طرف راغب کرے، جالب کہلاتا ہے۔ جالب عربی کے جلب سے مشتق ہے جس کے معنی اپنی اور کھینچنا ہے۔ لغت نامہ دھخدا میں جالب کا ایک مطلب ”شور کنندہ و آواز دھندہ“ ہے۔ جالب اسم بامسمی ہیں۔ وہ اپنی مترنم آواز سے انقلاب کا آوازہ لگاتے ہیں اور شور کرتے ہیں۔ ان کی آواز لاہور کے باب گل رخاں کے بے نام آدمی سے ہم آہنگ ہو جائے تو لاہور کی حکمران اشرافیہ کے لیے صور اسرافیل بن سکتی ہے۔ نارووال سے لاہور آنے والے فیض احمد فیض کی شاعری لاہور کی اشرافیہ کے بوجھل ضمیر کا معالجہ ہے اور، کلاسیکی رومانوی ڈکشن میں مستور انقلاب، گریز پا محبوبہ کی صورت چلمن سے لگا بیٹھا ہے، گل رنگ ہے۔ فیض کے ہاں مقتل سے قاتل، فاتح اور مقتول، سب سرخرو ہو کر نکلتے ہیں۔

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں[۲۳]

میانی افغاناں سے لاہور آنے والے حبیب جالب کی شاعری میں انقلاب، عملی اور عوامی ہو کر تلخ اور کھردرا ہے۔ یہ وہ

انقلاب ہے جس سے اشرافیہ کو ڈر لگتا ہے۔ ہر عوامی اور مقامی شکل سے اشرافیہ خائف رہتی ہے! حسین شہید سہروردی (۱۸۹۲ء-۱۹۶۳ء) کی یہ بات درست ہے کہ معلوم نہیں، حبیب جالب کتنے بڑے شاعر تھے مگر یہ کہ وہ ایک بہادر شاعر تھے! مقامی زبان میں شعر کہنے والے مادھولال حسین (۱۵۳۸ء-۱۵۹۹ء) اور استاد دامن (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) کی بھاگ وندی ان کی ماں بولی سے ہے۔ حبیب جالب کی بھاگ وندی انقلاب سے ہے!

ایک مشاعرے میں فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء) نے حبیب جالب کا تعارف اس طرح سے کرایا: ''میرابائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ یکجا ہوتے ہیں تو اسے حبیب جالب کہتے ہیں''۔ میانی افغاناں میں پیدا ہونے والے مہمند حبیب جالب کی آواز اور کلام میں ہریانوی سورداس اور راجستھانی میرابائی (وفات: ۱۵۴۷ء) کے سوز و ساز اور شعر و نغمہ میں لاہور کے محبوب فیض احمد فیض کا رومانوی انقلاب، استاد دامن کی مقامیت اور ملکہ ترنم نورجہاں (۱۹۲۶ء-۲۰۰۰ء) کی زندہ آواز کی کوئی مرکی یکجا ہو گئے تھے۔ شام چوراسی علاقے کی مٹی کی کچھ تاثیر حبیب جالب کے گلے میں اتری تھی۔ نغمگی اور حرفِ نغمہ کی اس دھنک کے پیچھے مقامی مٹی اور عام لوگوں سے محبت کی بھاگ وندی ہے۔ محبت کی حکمت اور رحمت ہے۔ محبت جو لاہوری گیٹ کے بے نام مقامی آدمی کی آواز کی کھنک اور جالب کی آواز میں بولتی ہے۔ محبت جو فاتحِ عالم ہے۔ محبت جو تلوار کی بجائے تنتر سے سماج کو بدلنے کی شاعری ہے۔ بہتر کل کی امید سے دمکتے چہرے حبیب جالب کا چہرہ ہیں۔ چہرے جو جالب کے شعروں میں نور بھرتے ہیں۔ بولتے ہیں۔ حسین شہید سہروردی نے کہا تھا کہ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ جالب کتنے بڑے شاعر ہیں لیکن جالب بہادر شاعر ہیں۔ بہادر جو ہارے ہوئے لشکر میں ہیں۔ ایک انقلابی جو اشرافیہ سے مختلف زندہ دلانِ لاہور کا عوامی چہرہ ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۷۸ء) محقق، نقاد، کالم نگار، لاہور۔

۱۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب (لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ۲۲۱۔

اک حسیں گاؤں تھا کنار آب
کتنا شاداب تھا دیار آب
کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مفلسی میں بھی ایک مستی تھی
کتنے دل دار تھے ہمارے دوست
وہ بچارے وہ بے سہارے دوست
اپنا اک دائرہ تھا دھرتی تھی
زندگی چین سے گزرتی تھی
قصہ جب یوسف و زلیخا کا
بیٹھے سروں میں چھڑتا تھا
قصر شاہوں کے ملنے لگتے تھے
چاک سینوں کے سلنے لگتے تھے

۲۔ ایضاً، ۱۹۔

۳۔ حبیب جالب، جالب بیتی (لاہور: طاہر سنز پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ۲۸۔
چڑی میوہ نمک، سرخ مرچوں اور پانی کا نیم گاڑھا محلول ہوتا ہے جسے سالن کے متبادل کے طور پر روٹی کھانے کے لیے غریب لوگ استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ طاہرہ جالب، یاسر جالب، مقالہ نگار سے گفتگو (لاہور: ۱۳ جنوری ۲۰۲۳ء)۔

۵۔ حبیب جالب، جالب بیتی (لاہور: طاہر سنز پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ۳۱۔

۶۔ طاہرہ جالب، یاسر جالب، مقالہ نگار سے گفتگو (لاہور: ۱۳ جنوری ۲۰۲۳ء)۔

۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (نئی دہلی: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۵ء)، ۱۱۶۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

۸۔ علی سردار جعفری، کلیاتِ علی سردار جعفری، جلد دوم، مرتب، علی احمد فاطمی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۵ء)، ۳۵۴۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگ آئی تھیں

۹۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ۱۹۴۔

۱۰۔ حبیب جالب، جالب بیتی، ۳۵۹۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۵۵۔

۱۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۲ء)، ۴۵۔
۱۳۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ۱۲۹۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے، تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو، ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں
تم نہیں چارہ گر کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

۱۴۔ خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ۷۹۔
۱۵۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ۲۰۳-۲۰۴۔

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیوں کر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے ؟

اہل ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پائل خاموش
پھر نہ تا زیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہو گی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انہیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے
تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

۱۶۔ رفعت عباس، ایس نارنگی اندر (ملتان: منزل آرٹ پریس، ۲۰۱۶ء)، ۸۹۔

۱۷۔ حبیب جالب، کلیات حبیب جالب (لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ۱۶۴۔

۱۸۔ حبیب جالب، جالب بیتی، ۸۔

۱۹۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (دہلی: دعوت آف سیٹ پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ۵۳۹۔

۲۰۔ علامہ اقبال، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''، مشمولہ کلیاتِ اقبال (دہلی: دعوت آف سیٹ پرنٹرز، ۱۹۹۳ء)، ۵۳۹۔

۲۱۔ اسلم انصاری، ''گوتم کا آخری وعظ''، مشمولہ منتخب کلیاتِ اسلم انصاری (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء)، ۶۵-۶۶۔

۲۲۔ سجاد ظہیر، روشنائی (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۶ء)، ۵۹۔

۲۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء)، ۲۴۰۔

Bibliography

Ansari, Aslam. *Muntakhib Kūlīyāt-i Āslam Ānṣārī*. Islamabad: National Book Foundation, 65-66, 2016.

Azami, Khalil ur Rehman. *Urdū mēn Taraqī Pasand Ādabī Teḥrīk*. Aligarh: Educational Book House, 45, 2006.

Faiz, Faiz Ahmad. *Nuskhā Ha-i Wafā*. New Delhi : Educational Book House, 2005.

Iqbal, Allama. *Kūlīyāt-i Iqbāl*. Delhi: Dawat Offset Printers, 1993.

Jalib, Habib. *Jālib Bītī*. Lahore: Tahir Sons Publishers, 2013.

——. *Kulīyāt-i Habīb Jālib*. Lahore: Marwa Publishers, 2007.

Kuliyāt-i Ali Sardār Jafrī. New Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language (NCPUL), 2005.

Zaheer, Sajad. *Roshna'i*. New Delhi: Ghalib Institute, 2006.